ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1955

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: سورۃ النساء اور سورہ المائدہ کا موضوعاتی مطالعہ (1955)

سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص قرآن و تفسیر)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق: 2 (یونٹ نمبر: 6 تا 9)

کل نمبر: 100 کامیابی کا نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کی متعلقہ اکائیوں کا اچھی طرح مطالعہ کریں، مفاہیم کو سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔ قرآنی آیات کے مفاہیم کی مزید تصدیق کے لیے مستند تفاسیر سے بھی رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: سورۃ النساء کی آیات 163 تا 166 میں انبیاء پر نازل کردہ وحی کی اہمیت اور حقیقت کی وضاحت کیجیے۔ (20 نمبر)

سوال نمبر 1: سورۃ النساء کی آیات 163 تا 166 میں انبیاء پر نازل کردہ وحی کی اہمیت اور حقیقت کی وضاحت کیجیے۔

تعارف

وحی عقیدۂ رسالت کی بنیاد اور دینِ اسلام کا سرچشمہ ہے۔ انسان کی عقل تنہا اللہ کی ذات و صفات، آخرت، حلال و حرام اور زندگی کے مقصد جیسے بنیادی سوالات کا قطعی جواب نہیں دے سکتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں پر وحی نازل فرما کر انسانیت کو ہدایت کا یقینی ذریعہ عطا کیا۔ سورۃ النساء کی آیات 163 تا 166 میں اسی حقیقت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ

رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں، بلکہ یہ اسی سلسلۂ وحی کی آخری کڑی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے تمام انبیاء پر جاری رہا؛ پھر آیات کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نازل کردہ کلام پر گواہی دی ہے اور فرشتوں کی گواہی کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ آیات دراصل اہلِ کتاب کے اس اعتراض کا جواب ہیں کہ محمد ﷺ پر وحی کیوں نازل ہوئی، اور ان میں وحی کی حقیقت، اس کی تاریخ اور اس کی اہمیت کو بڑی جامعیت سے واضح کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر جواب میں وحی کی لغوی و اصطلاحی تعریف، آیات کا مفہوم، وحی کی اہمیت اور اس کی مختلف صورتوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

وحی کا مفہوم

وحی کے لغوی معنی ہیں خفیہ اور تیز اشارہ کرنا، کوئی بات دل میں ڈالنا اور پوشیدہ طور پر اطلاع دینا۔ شریعت کی اصطلاح میں وحی سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ کلام اور وہ ہدایت ہے جو وہ اپنے کسی نبی یا رسول تک اس طریقے سے پہنچاتا ہے جو عام انسانی ذرائع سے ماورا ہو۔ قرآن مجید میں وحی کا لفظ وسیع مفاہیم میں بھی استعمال ہوا ہے؛ شہد کی مکھی کی طرف فطری الہام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں بات ڈالنا اور فرشتوں کی طرف حکمِ الٰہی بھی وحی کہلاتا ہے، مگر انبیاء کی طرف نازل ہونے والی وحی سے مراد وہ تشریعی و محفوظ ہدایت ہے جو دین و شریعت کی بنیاد بنتی ہے۔ یہ وحی دو قسم کی ہے: وحیِ متلو یعنی قرآن مجید جس کے الفاظ و معانی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں اور اس کی تلاوت کی جاتی ہے، اور وحیِ غیر متلو یعنی سنت و حدیث جس کے معانی اللہ کی طرف سے اور تعبیر کا انداز رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ وحی کی حقیقت کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ اسی سے نبوت کی صداقت، قرآن کی حجیت اور شریعت کی بالادستی ثابت ہوتی ہے۔

آیات 163 تا 166 کا مفہوم

آیت نمبر 163 میں ارشاد ہے کہ ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی جیسے ہم نے نوح اور ان کے بعد کے نبیوں کی طرف وحی بھیجی تھی، اور ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔ آیت نمبر 164 میں ان رسولوں کا ذکر ہے جن کے واقعات اللہ نے پہلے بیان فرمائے اور ان رسولوں کا بھی جن کے واقعات بیان نہیں ہوئے، اور اللہ نے موسیٰ سے باقاعدہ کلام فرمایا۔ آیت نمبر 165 میں اس سلسلۂ وحی و رسالت کا مقصد بیان ہوا کہ یہ رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے ہوئے تاکہ ان کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی حجت باقی نہ رہے۔ آیت نمبر 166 میں اہلِ کتاب کی تردید اور رسول کی تصدیق کا فیصلہ کن انداز اختیار کیا

گیا ہے کہ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز پر جو اس نے آپ کی طرف نازل کی ہے کہ اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں، اور اللہ گواہ کے طور پر کافی ہے۔ اس آخری جملے نے وحی کی صداقت پر مہر ثبت کر دی کہ جس کلام پر خالق کائنات خود گواہ ہو اس کے لیے کسی اور تصدیق کی حاجت نہیں۔

وحی کی اہمیت

وحی کی سب سے پہلی اہمیت یہ ہے کہ یہ ہدایت کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔ انسانی عقل تجربے اور مشاہدے تک محدود ہے، مابعد الطبیعی حقائق جیسے ذاتِ باری، وحی و رسالت، تقدیر، برزخ، حشر و نشر اور جنت و دوزخ تک اس کی رسائی نہیں؛ وحی نے ان حقائق کی قطعی خبر دے کر انسان کو شک و تذبذب سے نکالا۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ وحی تمام انبیاء کی مشترکہ میراث ہے؛ آیات 163 و 164 میں انبیاء کے طویل سلسلے کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ عقیدۂ توحید اور بنیادی شریعتی اصول ہمیشہ ایک رہے ہیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ کی وحی کو الگ یا اجنبی سمجھنا حقیقت سے آنکھ چرانا ہے۔ تیسری اہمیت یہ ہے کہ وحی قیامِ حجت کا ذریعہ ہے؛ آیت نمبر 165 کے مطابق انبیاء کی بعثت کے بعد قیامت کے دن کوئی یہ عذر نہیں کر سکے گا کہ اسے ہدایت پہنچی ہی نہیں۔ چوتھی اہمیت یہ ہے کہ وحی محفوظ و مصدقہ ہے؛ اللہ نے قرآن کی حفاظت کا خود ذمہ لیا، اس لیے آج بھی یہ وحی اپنی اصل صورت میں موجود ہے، برخلاف سابقہ کتابوں کے جن میں تحریف واقع ہو گئی۔ پانچویں اہمیت یہ ہے کہ وحی انسان کو دنیاوی زندگی کا مقصد اور اخلاقی معیار عطا کرتی ہے جس کے بغیر کوئی معاشرہ عدل و توازن پر قائم نہیں رہ سکتا۔

ان آیات میں وحی کی اہمیت کی ایک اور جہت یہ نمایاں ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کو وحی کی بنیاد قرار دیا ہے، یعنی قرآن انسانی تخیل یا تجربے کا نتیجہ نہیں بلکہ اس علیم و حکیم ہستی کا کلام ہے جس کا علم ہر زمان و مکان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے وحی سے حاصل ہونے والے احکام ہر دور کے لیے قابلِ عمل اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ وحی کی اہمیت کا یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ اس نے انبیاء کے درجات اور ان کی خصوصیات کو بھی واضح کر دیا: کسی نبی کو کتاب دی گئی، کسی کو زبور عطا ہوئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ کلام حاصل ہوا اور سیدنا محمد ﷺ کو قرآن جیسا جامع و آخری معجزہ عطا ہوا۔ اس تنوع کے باوجود تمام انبیاء پر ایمان لانا فرض ہے اور ان میں تفریق کرنے کو قرآن نے کفر قرار دیا ہے؛ اسی عقیدے نے امتِ مسلمہ کو تمام انبیاء کے احترام کا عالمگیر درس دیا جو کسی اور مذہبی روایت میں اس جامعیت سے نہیں ملتا۔

وحی کی صورتیں

سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر 51 میں وحی کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں: اللہ کسی انسان سے کلام نہیں کرتا مگر وحی کے ذریعے، یا پردے کے پیچھے سے، یا یہ کہ وہ کوئی فرشتہ بھیجے جو اس کے اذن سے جو چاہے وحی کرے۔ پہلی صورت وحیِ قلبی ہے جس میں بات براہِ راست نبی کے دل میں القا کر دی جاتی ہے، جیسے خواب کے ذریعے یا بیداری میں فرشتے کی آواز و صورت کے بغیر۔ دوسری صورت کلام من وراء حجاب ہے جس کا شرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر حاصل ہوا، اور معراج کی رات رسول اللہ ﷺ کو بھی خاص قرب میں یہ شرف نصیب ہوا۔ تیسری اور عام صورت فرشتے کے ذریعے وحی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ کا پیغام لے کر رسولؐ تک آتے۔ کبھی وہ اصل صورت میں نظر آتے، کبھی انسانی شکل میں تشریف لاتے، اور کبھی گھنٹی کی سی آواز کے ساتھ وحی نازل ہوتی جو رسول اللہ ﷺ پر سب سے شدید کیفیت ہوتی تھی۔ ان صورتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کا نزول ایک حقیقی خارجی واقعہ تھا، نہ کہ رسول کی ذہنی کیفیت یا شاعرانہ وجدان، جیسا کہ بعض مستشرقین نے گمان کیا، کیونکہ وحی کی کیفیت رسول کے اختیار سے باہر تھی اور بسا اوقات ان سوالات کے جواب میں آتی تھی جن کا انتظار صحابہ کو بھی ہوتا تھا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیات 163 تا 166 نے وحی کی حقیقت کو اس طرح واضح کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی اسی قدیم و متسلسل سلسلے کی تکمیل ہے جو نوح علیہ السلام سے شروع ہو کر تمام انبیاء سے ہوتا ہوا آپ ﷺ پر آ کر مکمل ہوا؛ اس وحی کا مقصد بشارت و انذار کے ذریعے انسانوں پر حجت تمام کرنا ہے، اور اس کی صداقت پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے گواہ ہیں۔ وحی کی یہی عظمت دینِ اسلام کی بنیاد ہے کہ مومن اپنی زندگی کے ہر فیصلے میں اسی محفوظ و یقینی ہدایت کی طرف رجوع کرتا ہے اور عقل کو اسی وحی کی روشنی میں استعمال کرتا ہے۔

سوال نمبر2: اہلِ کتاب سے کون لوگ مراد ہیں؟ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر4 اور5 کی روشنی میں اہلِ کتاب کے ذبیحے اور ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح کے احکامات تحریر کیجیے۔ (20 نمبر)

سوال نمبر2: اہلِ کتاب سے کون لوگ مراد ہیں؟ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر4 اور5 کی روشنی میں اہلِ کتاب کے ذبیحے اور ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح کے احکامات تحریر کیجیے۔

تعارف

قرآن مجید میں "اہلِ کتاب" کی اصطلاح کثرت سے استعمال ہوئی ہے اور اسلامی شریعت میں ان لوگوں کے ساتھ معاملات کے کئی خاص احکام مقرر کیے گئے ہیں جو دیگر غیر مسلموں سے مختلف ہیں۔ سورۃ المائدہ کی آیات نمبر 4 اور 5 میں انہی خاص احکام میں سے دو اہم حکم بیان ہوئے ہیں: اہلِ کتاب کا کھانا اور ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہونا، اور اہلِ کتاب کی پاک دامن عورتوں سے نکاح کا جواز۔ اس سے پہلے آیت نمبر 4 میں عام طور پر حلال و طیب چیزوں اور سدھائے ہوئے شکاری جانوروں کے شکار کے حلال ہونے کا بیان ہے جو اسی ذبیحہ و طعام کے سیاق سے جڑا ہوا ہے۔ زیرِ نظر جواب میں پہلے اہلِ کتاب کا مفہوم اور ان کی تعیین بیان کی جائے گی، پھر ان کے ذبیحے کے احکام و شرائط اور آخر میں ان کی عورتوں سے نکاح کے احکامات، شرائط اور حکمتوں کی تفصیل پیش کی جائے گی۔

اہلِ کتاب سے مراد

اہلِ کتاب سے مراد وہ امتیں ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابیں نازل فرمائیں اور جو ان کتابوں اور اپنے انبیاء کی طرف نسبت رکھتی ہیں۔ قرآن مجید کی روشنی میں اس اصطلاح کا اولین اور متفق علیہ مصداق یہود و نصاریٰ ہیں: یہود جن پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے تورات نازل ہوئی اور نصاریٰ جن پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے انجیل نازل ہوئی۔ قرآن نے دونوں کو بارہا "یا اہل الکتاب" کہہ کر مخاطب کیا ہے اور ان سے اپنے انبیاء و کتب پر عمل اور آخری نبی ﷺ پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ فقہاء کے درمیان بحث یہ رہی ہے کہ آیا صابئین اور مجوس بھی اس حکم میں داخل ہیں یا نہیں؛ صابئین کے بارے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وہ اہلِ کتاب کے حکم میں ہیں جبکہ دیگر ائمہ کے ہاں تفصیل ہے، اور مجوس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ اہلِ کتاب جیسا سلوک کرو، مگر جمہور فقہاء کے نزدیک مجوس کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح اہلِ کتاب کے حکم میں شامل نہیں، ان سے صرف جزیہ کے معاملے میں مماثلت ہے۔ موجودہ دور کے وہ یہودی و عیسائی جو نسلاً و اعتقاداً انہی دینوں سے وابستہ ہیں اور اپنے آپ کو تورات و انجیل کی طرف منسوب کرتے ہیں، جمہور علماء کے نزدیک اہلِ کتاب ہی کے حکم میں داخل ہیں، خواہ ان کے عقائد میں تحریف کیوں نہ واقع ہو چکی ہو، کیونکہ قرآن کے نزول کے وقت بھی ان کے عقائد میں تحریف موجود تھی پھر بھی انہیں اہلِ کتاب ہی کہا گیا۔

اہلِ کتاب کا ذبیحہ اور کھانا: آیات 4 و 5 کی روشنی میں

آیت نمبر 4 میں ارشاد ہے کہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے؛ کہہ دیجیے کہ تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں، اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سدھار کھا ہو، انہیں اللہ کے سکھائے ہوئے علم کے مطابق تعلیم دی ہو، تو وہ شکار وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اسے کھاؤ اور اس پر اللہ کا نام لو۔ اس آیت نے دو اصول دیے کہ اصل حلت طیب چیزوں کی ہے اور تربیت یافتہ شکاری جانور کا پکڑا ہوا شکار بھی اسی شرط کے ساتھ حلال ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔ آیت نمبر 5 میں اسی سیاق کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا کہ آج کے دن تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں، اور خصوصاً ان کا اور اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لیے [illegible] اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔ مفسرین و فقہاء کے نزدیک اہلِ کتاب کے کھانے سے مراد ذبیحہ ہے، کیونکہ باقی کھانے پینے کی چیزیں تو ہر کسی کی حلال ہوتی ہیں جب وہ بذاتِ خود حرام نہ ہوں۔ اس آیت سے اہلِ کتاب کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور مسلمان کے لیے حلال ثابت ہوتا ہے، بشرطیکہ جانور بذاتِ خود حلال ہو اور ذبح شرعی طریقے سے کیا گیا ہو۔

ذبیحۂ اہلِ کتاب کی شرائط پر فقہاء نے تفصیل بیان کی ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ ذبح کرنے والا حقیقتاً اہلِ کتاب میں سے ہو، یعنی یہودی یا عیسائی ہو، ملحد یا دہریہ نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ذبح کا طریقہ شرعی ہو، یعنی جانور کی گردن کی رگیں کاٹ کر خون بہایا جائے؛ گلا گھونٹ کر، بجلی کے جھٹکے سے یا سر پر ضرب لگا کر مارا گیا جانور مردار کے حکم میں ہو گا اور اسے اہلِ کتاب کا ذبیحہ کہہ کر حلال نہیں کیا جا سکتا۔ تیسری شرط تسمیہ یعنی اللہ کا نام لینے کی ہے؛ جمہور فقہاء کے نزدیک اگر اہلِ کتاب کا ذابح اللہ کا نام لے یا کم از کم مسیح یا کسی مخلوق کے نام پر ذبح نہ کرے تو ذبیحہ حلال ہے، کیونکہ قرآن نے ان کے کھانے کو مطلقاً حلال قرار دیا ہے اور صحابہ کرام اہلِ کتاب کا ذبیحہ کھایا کرتے تھے۔ البتہ اگر یقین ہو جائے کہ جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہے تو وہ سورۃ الانعام کے اس حکم کے تحت حرام ہو گا جس میں غیر اللہ کے نامزد جانور سے منع کیا گیا ہے۔ موجودہ دور میں صنعتی ذبح خانوں کے بارے میں علماء کی یہی رہنمائی ہے کہ جہاں ذبح کے شرعی طریقے اور ذابح کے اہلِ کتاب ہونے کی تحقیق ممکن ہو وہیں کا ذبیحہ استعمال کیا جائے، اور شک کی صورت میں احتیاط اختیار کی جائے۔

جدول: ذبیحۂ اہلِ کتاب کے جواز کی شرائط

شرط	وضاحت
ذابح کا اہلِ کتاب ہونا	ذبح کرنے والا یہودی یا عیسائی ہو، ملحد نہ ہو

جانور کا حلال ہونا	جانور بذات خود حلال الانواع ہو؛ خنزیر یا کوئی حرام جانور نہ ہو
شرعی طریقۂ ذبح	گردن کی رگیں کاٹ کر خون بہایا جائے؛ گھونٹا ہوا یا ضرب سے مارا گیا جانور مردار ہے
غیر اللہ کے نام کی عدم موجودگی	یقینی طور پر غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا جانور حرام ہے

اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کے احکامات

آیت نمبر 5 کے دوسرے حصے میں ارشاد ہے کہ پاک دامن مؤمنہ عورتیں اور تم سے پہلے اہلِ کتاب کی پاک دامن عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں جب تم انہیں ان کے مہر دے دو، اس طرح کہ تم نکاح کرنے والے ہو، نہ کھلی بدکاری کرنے والے اور نہ چھپی آشنائی رکھنے والے۔ اس آیت نے اہلِ کتاب کی محصنہ یعنی پاک دامن اور آزاد عورت سے مسلمان مرد کے نکاح کو حلال قرار دیا ہے اور اس نکاح کی شرائط بھی ساتھ بیان کر دی ہیں: پہلی شرط یہ ہے کہ عورت محصنہ ہو، یعنی عفت و پاک دامنی کی حامل ہو، علانیہ اور بے باک نہ ہو؛ ابن عباس رضی اللہ عنہما سمیت کئی مفسرین نے محصنات سے مراد آزاد و پاک دامن عورتیں لی ہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ نکاح باقاعدہ عقد کے ذریعے ہو، مہر ادا کیا جائے اور گواہوں و اعلان کے ساتھ ہو، کیونکہ آیت نے "محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان" کہہ کر نکاح کو کھلی و چھپی ہر قسم کی بے قاعدہ تعلقات سے واضح طور پر الگ کر دیا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ حکم مردوں کے لیے ہے؛ مسلمان عورت کا نکاح کسی غیر مسلم، خواہ اہلِ کتاب ہی کیوں نہ ہو، سے بالاجماع جائز نہیں، کیونکہ سورۃ البقرہ اور سورۃ الممتحنہ کے احکام اس کی صریح ممانعت کرتے ہیں اور خانگی نظام میں دین کی سربراہی کا اصول بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے۔

اس جواز کے باوجود فقہاء و خلفاء نے اس کی عملی حدود پر بھی گفتگو کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض سرکاری عہدے داروں کو کتابیہ عورتوں سے شادی سے منع فرمایا تھا تاکہ مسلم عورتوں کے رشتے متاثر نہ ہوں اور فتنے کا دروازہ بند رہے؛ یہ ممانعت حرمت کے طور پر نہیں بلکہ مصلحت و سیاستِ شرعی کے طور پر تھی۔ علماء اس نکاح کی حکمتوں میں یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے اہلِ کتاب کے ساتھ سماجی قربت پیدا ہوتی ہے، اسلام کی دعوت کے راستے کھلتے ہیں اور خاندانی فضا میں کتابیہ بیوی احترامِ انبیاء و آخرت جیسے مشترک عقائد کی وجہ سے دیگر مشرک عورتوں کی نسبت اسلام سے قریب تر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ تنبیہ بھی کی جاتی ہے کہ اولاد کی دینی تربیت، گھریلو ماحول اور دینی غیرت کے پیشِ نظر مسلمان عورت سے نکاح ہی اصل و اولیٰ ہے اور

کتابیہ سے نکاح ایک رخصت ہے جسے ضرورت و مصلحت کے دائرے میں استعمال کرنا چاہیے۔ نکاح کے بعد کتابیہ بیوی کے وہی حقوق ہوں گے جو مسلم بیوی کے ہیں؛ وہ اپنے مذہب کی ذاتی عبادات میں آزاد رہے گی، اس کے مہر، نفقہ اور عزت کی حفاظت شوہر پر لازم ہو گی اور اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں جن پر تورات و انجیل نازل ہوئی؛ سورۃ المائدہ کی آیات 4 و 5 نے طیب چیزوں اور سدھائے گئے شکاری جانوروں کے شکار کی حلت بیان کرنے کے ساتھ اہلِ کتاب کے ذبیحے کو شرعی طریقۂ ذبح کی شرائط کے ساتھ حلال قرار دیا، ان کی پاک دامن عورتوں سے باقاعدہ مہر و عقد کے ساتھ نکاح کی اجازت دی۔ ان احکامات سے اسلام کے اس متوازن مزاج کا پتہ چلتا ہے جو اہلِ کتاب سے مکمل قطع تعلق کے بجائے مشترک اقدار کی بنیاد پر پُرامن بقائے باہمی اور منصفانہ معاملات کا قائل ہے، البتہ عقیدہ و تربیت کے بنیادی امور میں اپنی حدود کی پوری حفاظت بھی کرتا ہے۔

سوال نمبر3: سورۃ المائدہ کی آیت نمبر17 کی روشنی میں نصاریٰ کے "عقیدۂ حلول مسیح ابن مریم" کی وضاحت کیجیے۔ (20 نمبر)

سوال نمبر3: سورۃ المائدہ کی آیت نمبر17 کی روشنی میں نصاریٰ کے "عقیدۂ حلول مسیح ابن مریم" کی وضاحت کیجیے۔

تعارف

عقیدۂ توحید اسلام کی بنیاد اور تمام انبیائے کرام کی دعوت کا مرکز رہا ہے، جبکہ شرک اور مخلوق کو خدا کا درجہ دینا ہمیشہ انبیاء کی تعلیمات سے انحراف کا نتیجہ قرار پایا ہے۔ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 17 میں نصاریٰ یعنی عیسائیوں کے اس گمراہ کن عقیدے کی تردید کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم میں حلول کر گیا ہے، یعنی گویا اللہ ہی مسیح ہے۔ ارشادِ باری ہے کہ یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ بے شک اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے؛ کہہ دیجیے کہ پھر کون ہے جو اللہ کے سامنے کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو اگر وہ چاہے کہ مسیح ابن مریم کو، اس کی والدہ کو اور زمین میں رہنے والے تمام لوگوں کو ہلاک کر دے، اور آسمانوں و زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ زیرِ نظر جواب میں پہلے عقیدۂ حلول کا مفہوم اور اس کی تاریخی صورت بیان کی جائے گی، پھر نصاریٰ کے عقیدے کی تشکیل و اقسام اور آخر میں آیت نمبر 17 کی روشنی میں اس کی مدلل تردید پیش کی جائے گی۔

عقیدۂ حلول کا مفہوم

حلول کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کا دوسری چیز میں اترنا اور اس کے اندر سما جانا۔ اصطلاحی طور پر عقیدۂ حلول سے مراد یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسانی جسم یا مخلوق میں اتر آیا ہے اور اس وجود کے ساتھ اس طرح متحد ہو گیا ہے کہ اس مخلوق ہی کو خدا سمجھا جائے۔ یہ عقیدہ صوفیانہ و فلسفیانہ ادب میں بھی حلول و اتحاد کے نام سے زیرِ بحث رہا ہے اور اسلامی علمِ کلام میں اسے قطعاً باطل قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جسم، مکان اور حلول و اتحاد کی صفاتِ حلوث سے پاک ہے؛ وہ نہ کسی میں سما سکتا ہے نہ کسی شے سے متحد ہو سکتا ہے، کیونکہ حلول کرنے والی ذات محدود، محتاج اور قابلِ تغیر ہوتی ہے جبکہ اللہ ازلی، ابدی، بے نیاز اور ہر نقص سے منزہ ہے۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ نصاریٰ کے ہاں یہ عقیدہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش، ان کے معجزات اور آپ کے لیے قرآن و انجیل میں استعمال ہونے والے القاب جیسے کلمۃ اللہ اور روح اللہ کو غلط مفہوم دے کر انہیں ذاتِ الٰہی کا مظہر یا خود خدا قرار دے دیا۔

نصاریٰ کے عقیدے کی تشکیل اور اقسام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم توحیدِ خالص تھی؛ انجیل میں بھی اقرار ملتا ہے کہ اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے، اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو اللہ کا بندہ اور رسول ہی بتایا۔ ابتدائی موحد عیسائی حضرت عیسیٰ کو نبی و رسول مانتے تھے، مگر بعد کے ادوار میں، خصوصاً یونانی فلسفے اور رومی تہذیب کے اثرات کے تحت، نصرانیت میں الوہیتِ مسیح کا عقیدہ داخل ہوا۔ 325 عیسوی میں نیقیہ کی کونسل میں مسیح کو "خدا سے خدا" قرار دیا گیا اور تثلیث یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس کے تین اقانیم میں ایک خدا کا نظریہ باضابطہ عقیدہ بنا۔ اسی تدریجی انحراف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف عیسائی فرقوں نے مختلف انداز میں حلول و اتحاد کا عقیدہ اپنایا: بعض نے کہا کہ خدا مسیح میں اس طرح حلول کر گیا جیسے روح بدن میں ہے؛ بعض نے اتحاد کا یہ تصور دیا کہ لاہوت اور ناسوت یعنی خدائی اور انسانی طبیعتیں ایک شخص میں یکجا ہو گئی ہیں؛ اور بعض غالی فرقوں نے براہِ راست یہ کہا کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے۔ قرآن مجید کی آیت نمبر 17 اسی آخری اور صریح عقیدے کو موضوع بناتی ہے، جبکہ اسی سورت کی آیت نمبر 72 و 73 میں بھی الوہیتِ مسیح اور تثلیث دونوں کی تردید کی گئی ہے، اور آیت نمبر 75 میں فرمایا گیا ہے کہ مسیح ابن مریم ایک رسول ہی ہیں جن سے پہلے بھی رسول گزر چکے اور ان کی والدہ صدیقہ تھیں، دونوں کھانا کھایا کرتے تھے، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ مخلوق و محتاج تھے، خدا نہیں تھے۔

آیت نمبر 17 کی روشنی میں عقیدۂ حلول کی تردید

آیت نمبر 17 نے اس عقیدے کی تردید کئی دلیلوں سے کی ہے۔ پہلی دلیل اختیار و قدرت کی ہے کہ اگر مسیح خود خدا ہوتا تو اسے فنا و ہلاکت سے بچانے کا اختیار خود اس کے پاس ہونا چاہیے تھا؛ مگر اللہ فرماتا ہے کہ اگر اللہ چاہے کہ مسیح، اس کی والدہ اور تمام اہلِ زمین کو ہلاک کر دے تو کون ہے جو اسے روک سکے؟ یہ سوال بتاتا ہے کہ مسیح بھی اللہ کی قدرت کے تابع مخلوق ہے، اور جو ہستی فنا کے امکان کے دائرے میں ہو وہ ازلی خدا نہیں ہو سکتی۔ دوسری دلیل کلیت و بادشاہی کی ہے کہ آسمانوں و زمین کی بادشاہی صرف اللہ کی ہے؛ اگر مسیح خدا ہوتا تو اس کی بادشاہی بھی ازلی و ابدی ہونی چاہیے تھی، حالانکہ اس کی دنیاوی زندگی محدود مدت اور محدود علاقے تک محدود تھی۔ تیسری دلیل خالقیت کی ہے کہ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے؛ مسیح کی بغیر باپ کے پیدائش اللہ کی اسی خلاقیت کا ایک نمونہ ہے، جیسے آدم علیہ السلام کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا گیا، اور حیرت انگیز تخلیق پیدا کرنے والے کو خالق نہیں بنا دیتی۔ چوتھی دلیل احتیاج کی ہے جو قرآن نے دیگر آیات میں بیان کی ہے کہ مسیح اور ان کی والدہ کھانا کھاتے تھے، یعنی وہ بقا کے لیے غذا کے محتاج تھے، جبکہ اللہ الصمد ہے، سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔

اس عقلی و نقلی تردید کے ساتھ آیت نے اس عقیدے کے شرعی حکم کو بھی واضح کر دیا ہے کہ ایسا کہنے والوں نے "کفر کیا"، کیونکہ یہ توحید کی صریح نفی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ قرآن کا یہ رد مسیح علیہ السلام کی توہین نہیں بلکہ ان کی اصل عظمت کی حفاظت ہے: قرآن نے انہیں اللہ کا بندہ، رسول، کلمۃ اللہ اور وجیہ فی الدنیا و الآخرۃ قرار دیا ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کو صدیقہ اور تمام جہانوں کی عورتوں پر منتخب قرار دیا ہے۔ غلو کا یہی انجام ہوتا ہے کہ محبت عبادت میں بدل جاتی ہے اور نبی کی تعلیم الٹی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے امت کو خبردار فرمایا کہ میری تعریف میں اس طرح مبالغہ نہ کرنا جیسے نصاریٰ نے ابن مریم کے بارے میں کیا، میں اللہ کا بندہ ہوں، پس مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔ اس حدیث نے عقیدۂ حلول کی ہر ممکن صورت کے خلاف امت کے لیے حفاظتی اصول مقرر کر دیا ہے کہ انبیاء و اولیاء کی محبت و تعظیم اپنی جگہ، مگر الوہیت و ربوبیت کے اوصاف صرف اللہ کے لیے خاص ہیں۔

عقیدۂ حلول کے اثرات اور اسلامی موقف کا خلاصہ

عقیدۂ حلول کے اثرات دینی و فکری دونوں سطحوں پر گہرے ہوتے ہیں: یہ عقیدہ توحید کو ختم کر کے انسان پرستی کی راہ کھولتا ہے، عقل کو ایسی متناقض باتوں کا قائل کرتا ہے جنہیں وہ قبول نہیں کر سکتی، اور بندے اور خدا کے درمیان تعلق کو براہِ راست توبہ و عبادت کے بجائے مظاہر پرستی کی طرف موڑ دیتا ہے۔ اسلامی موقف اس باب میں بالکل واضح اور یکسو ہے کہ اللہ واحد ہے، نہ

اس نے کسی کو جنا نہ وہ جنا گیا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے؛ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ رسول اور اس کے کلمے ہیں جنہیں اس نے مریم کی طرف القا کیا، ان کی معجزانہ ولادت اور معجزات اللہ کی قدرت کے شاہکار ہیں مگر ان میں سے کوئی چیز بھی انہیں مخلوق کے مرتبے سے بڑھا کر خالق کے مرتبے پر نہیں پہنچاتی۔ یہی متوازن عقیدہ قرآن نے سورۃ المائدہ کی اس آیت اور اس سورت کی دیگر آیات میں پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے تاکہ اہلِ کتاب بھی ہدایت پائیں اور امت بھی غلو و شرک سے محفوظ رہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ نصاریٰ کا عقیدۂ حلول، یعنی اللہ کا مسیح ابن مریم میں سما جانا یا اللہ ہی کا مسیح ہونا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل توحیدی دعوت سے انحراف اور بعد کے فلسفیانہ و تہذیبی اثرات کی پیداوار ہے۔ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 17 نے اسے کفر قرار دے کر اس کی تردید اختیارِ الٰہی، بادشاہیِ کائنات، قدرتِ تخلیق اور مسیح کے مخلوق و محتاج ہونے کی دلیلوں سے کی ہے اور توحیدِ خالص کا وہ عقیدہ پیش کیا ہے جو تمام انبیاء کی مشترکہ میراث ہے۔ اس آیت کا مطالعہ مومن کے عقیدے کو پختہ کرتا ہے کہ عبادت و الوہیت صرف اسی ذات کے لیے ہے جو ازلی، بے نیاز اور ہر شے پر قادر ہے۔

سوال نمبر4: سورۃ المائدہ کی آیات 44 تا 46 کی روشنی میں کتابِ الٰہی کے نزول کا حقیقی مقصد اور حدود و تعزیرات کے احکامات کی وضاحت کریں۔ (20 نمبر)

سوال نمبر4: سورۃ المائدہ کی آیات 44 تا 46 کی روشنی میں کتابِ الٰہی کے نزول کا حقیقی مقصد اور حدود و تعزیرات کے احکامات کی وضاحت کریں۔

تعارف

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے مختلف ادوار میں آسمانی کتابیں نازل فرمائیں جن میں تورات، انجیل اور قرآن مجید نمایاں ہیں۔ سورۃ المائدہ کی آیات 44 تا 46 میں تورات و انجیل کے نزول، ان کے ذریعے انبیاء و علماء کے فیصلے کرنے اور کتابِ الٰہی کے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کے انجام کا ذکر ہے۔ آیت نمبر 44 میں تورات کو ہدایت و نور قرار دیا گیا ہے اور اس کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو کافر کہا گیا ہے۔ آیت نمبر 45 میں تورات کے قانونِ قصاص کا بیان ہے کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ اور اسی طرح دیگر اعضا کا بدلہ مقرر کیا

گیا، البتہ معاف کر دینے کو صدقہ و کفارہ قرار دیا گیا۔ آیت نمبر 46 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا ذکر ہے کہ اللہ نے انہیں انجیل عطا کی جس میں ہدایت و نور ہے۔ زیرِ نظر جواب میں ان آیات کی روشنی میں کتابِ الٰہی کے نزول کا حقیقی مقصد اور نظامِ سزا کے دو بڑے دائروں یعنی حدود و تعزیرات کے احکامات کی وضاحت پیش کی جائے گی۔

آیات 44 تا 46 کا مفہوم

آیت نمبر 44 میں ارشاد ہے کہ بے شک ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے؛ اس کے مطابق اللہ کے فرمانبردار انبیاء یہود کے درمیان فیصلہ کرتے تھے اور درویش و علماء بھی، اس لیے کہ انہیں اللہ کی کتاب کی حفاظت سونپی گئی تھی اور وہ اس پر گواہ تھے؛ پس لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو؛ اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہی لوگ کافر ہیں۔ آیت نمبر 45 قصاص کی تفصیل بیان کرتی ہے کہ ہم نے تورات میں ان پر فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں بدلہ برابر کا ہے؛ پھر جو اسے معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے؛ اور جو اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہی لوگ ظالم ہیں۔ آیت نمبر 46 میں انجیل کا ذکر ہے کہ ہم نے ان انبیاء کے نقشِ قدم پر عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا جو تورات کی تصدیق کرنے والے تھے اور ہم نے انہیں انجیل دی جس میں ہدایت و نور ہے اور جو تورات کی تصدیق کرتی اور اہلِ تقویٰ کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔ ان تینوں آیات میں کتاب، عدل، فیصلہ اور ہدایت کے باہمی ربط کو غیر معمولی جامعیت سے بیان کر دیا گیا ہے۔

کتابِ الٰہی کے نزول کا حقیقی مقصد

ان آیات سے کتابِ الٰہی کے نزول کے مقاصد واضح ہوتے ہیں۔ پہلا مقصد ہدایت و روشنی ہے؛ تورات و انجیل دونوں کو "ھدی و نور" کہا گیا، یعنی کتاب انسان کو عقیدہ، عبادت، اخلاق اور معاملات میں صحیح راہ دکھاتی اور جہالت و گمراہی کے اندھیروں سے نکالتی ہے۔ دوسرا مقصد عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا ہے؛ انبیاء کتاب کے ذریعے فیصلے کیا کرتے تھے، چنانچہ کتاب محض تلاوت و برکت کی چیز نہیں بلکہ زندگی کے تنازعات میں آخری مرجع اور قانون کی بنیاد ہے۔ تیسرا مقصد کتاب کی حفاظت و شہادت ہے؛ علماء و ربانیوں کو کتاب کا محافظ و گواہ بنایا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا علم رکھنے والوں پر اس کی حفاظت، تعلیم اور نفاذ کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ چوتھا مقصد اللہ کا خوف اور بے نیازی ہے کہ قاضی و حکمران لوگوں کے خوف یا دنیاوی قیمت و مفاد کی وجہ سے کتاب کے حکم کو نہ بدلے؛ آیت نے آیات کے بدلے تھوڑی قیمت لینے سے منع کر کے رشوت، سفارش اور اقتدار کے دباؤ سے فیصلے متاثر ہونے کی ہر صورت کو رد کر دیا۔ پانچواں مقصد تسلسل و تصدیق ہے کہ ہر نئی کتاب پچھلی کتاب کی تصدیق کرتی ہوئی آتی ہے اور بالآخر قرآن اس سلسلے کی آخری اور محافظ کتاب ہے جسے سورۃ المائدہ ہی میں سابقہ کتابوں

پر "مہیمن" قرار دیا گیا ہے۔ خسارے سے بچنے کا یہی واحد راستہ ہے کہ فیصلے کتابِ الٰہی کے مطابق ہوں، ورنہ آیت کی وعید کے مطابق ایسا نظام ظلم و فسق کی طرف چلا جاتا ہے، جیسا کہ اسی تسلسل میں آیت نمبر 47 میں فیصلہ نہ کرنے والوں کو فاسق بھی کہا گیا ہے۔

حدود کے احکامات

کتابِ الٰہی کے نفاذ کا ایک نمایاں شعبہ نظامِ سزا ہے جس کے دو دائرے ہیں: حدود اور تعزیرات۔ حدود سے مراد وہ متعین سزائیں ہیں جن کی مقدار و نوعیت قرآن و سنت میں مقرر کر دی گئی ہے اور جن میں قاضی یا حکمران کو کمی بیشی کا اختیار نہیں، کیونکہ یہ اللہ کا حق ہیں۔ ان میں زنا کی حد، قذف یعنی پاک دامن پر زنا کی جھوٹی تہمت کی حد، چوری کی حد، شراب نوشی کی حد اور ڈکیتی و فساد فی الارض (حرابہ) کی سزائیں شامل ہیں، جن کی تفصیلات قرآن و سنت و فقہ میں موجود ہیں؛ چوری کی حد کا ذکر خود سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 38 میں ہے اور حرابہ کی سزا آیت نمبر 33 میں بیان ہوئی ہے، جو اسی سیاق کا حصہ ہے۔ حدود کے نفاذ کا مقصد انتقام نہیں بلکہ جرم کی روک تھام، معاشرے کے امن کا تحفظ اور دوسروں کے لیے عبرت ہے؛ خود قرآن نے قصاص کے ضمن میں فرمایا ہے کہ قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے، یعنی سزا کے خوف سے قتل و فساد رک جاتا ہے اور بے شمار جانیں محفوظ رہتی ہیں۔ حدود کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ شبہات سے حدود ساقط ہو جاتی ہیں اور ثبوت کے لیے سخت ترین معیار برقرار رکھا گیا ہے، تاکہ سزا یقینی جرم پر ہی جاری ہو۔

جدول: حدود و تعزیرات کا تقابل

پہلو	حدود	تعزیرات
تعریف	مقرر کردہ سزائیں جن کی نوعیت و مقدار شریعت نے طے کر دی ہے	وہ سزائیں جن کی نوعیت و مقدار قاضی کی صوابدید پر چھوڑی گئی ہے
اختیار	قاضی یا حکمران کمی بیشی نہیں کر سکتا	مجرم کی حالت، جرم کی نوعیت اور مصلحت دیکھ کر سزا متعین ہوتی ہے
مثالیں	زنا، قذف، چوری، حرابہ اور شراب نوشی کی مقررہ سزائیں	تنبیہ، وعظ، جرمانہ، قید یا کوڑے (فقہی حدود کے اندر)

مقصد	جرم کی قطعی روک تھام، عبرت اور حق اللہ کی تعمیل	اصلاح و تادیب اور ایسے جرائم کی روک تھام جن کی حد مقرر نہیں

تعزیرات کے احکامات

تعزیر سے مراد وہ تادیبی سزا ہے جو ان جرائم پر دی جاتی ہے جن کے لیے نہ حد مقرر ہے نہ کفارہ، جن میں حد کی شرائط پوری نہ ہونے کی وجہ سے حد جاری نہیں ہو سکتی۔ تعزیر کی نوعیت کا تعین قاضی مجرم کی شخصیت، جرم کی سنگینی، حالات اور سماجی مصلحت کو دیکھ کر کرتا ہے؛ یہ وعظ و نصیحت اور سرزنش سے شروع ہو کر جرمانہ، قید اور مقررہ حد سے کم کوڑوں تک جا سکتی ہے، مگر فقہاء نے اسے ہر حال میں حدود کی مقدار سے کم رکھنے اور ظلم و زیادتی سے بچنے کی قید لگائی ہے۔ زیرِ بحث آیات کے سیاق سے تعزیر کا اصول اس طرح نکلتا ہے کہ کتابِ الٰہی کا مقصد صرف چند مقررہ سزائیں نہیں بلکہ پورے معاشرے میں عدل کا نظام ہے؛ جہاں کتاب نے سزا متعین کر دی وہاں حدود ہیں، اور جہاں فیصلہ عدل، مصلحت کے اصولوں پر چھوڑا وہاں تعزیرات کا دائرہ ہے، مگر دونوں صورتوں میں فیصلہ کتاب کی روح اور انصاف کے مطابق ہونا شرط ہے۔ قصاص کے باب میں بھی یہی توازن نظر آتا ہے کہ بدلہ برابر کا مقرر کیا گیا مگر معافی کو صدقہ و کفارہ قرار دے کر رحمت کا دروازہ کھلا رکھا گیا؛ یعنی نظامِ سزا کا ہر پہلو عدل اور اصلاح کے گرد گھومتا ہے، نہ محض سختی ہے نہ محض نرمی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ تعزیرات کو دنیا کے قدیم و جدید نظاموں میں ایک متوازن اور مقصدی نظام سمجھا جاتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ المائدہ کی آیات 44 تا 46 نے کتابِ الٰہی کے نزول کا حقیقی مقصد ہدایت و نور کی فراہمی، زندگی کے فیصلوں کے لیے عدل پر مبنی مرجع بننا، اہلِ علم کے ذریعے اس کی حفاظت اور ہر قسم کے خوف و لالچ سے بالاتر ہو کر اس کے مطابق فیصلہ کرنا قرار دیا ہے۔ اسی نظام کا عملی پہلو حدود و تعزیرات ہیں: حدود مقررہ سزاؤں کے ذریعے بڑے جرائم کی قطعی روک تھام کرتی ہیں اور تعزیرات قاضی کی منصفانہ صوابدید سے باقی جرائم کی اصلاح و تادیب کا اہتمام کرتی ہیں۔ جب کوئی معاشرہ کتابِ الٰہی کو محض رسم کی کتاب بنا دیتا ہے تو وہ اس کے مقصد سے محروم ہو جاتا ہے، اور جب اسے نظامِ عدل کی بنیاد بناتا ہے تو اسی سے امن، انصاف اور ہدایت کے ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔

سوال نمبر5: سورۃ المائدہ کی آیات101 تا103 کے موضوعات(فضول سوالات کی ممانعت اور دورِ جاہلیت کی نذر اور منت) پر جامع اور مفصل نوٹ تحریر کیجیے۔(20نمبر)

سوال نمبر5: سورۃ المائدہ کی آیات 101 تا 103 کے موضوعات(فضول سوالات کی ممانعت اور دورِ جاہلیت کی نذر اور منت (پر جامع اور مفصل نوٹ تحریر کیجیے۔

تعارف

سورۃ المائدہ کی آیات 101 تا 103 دو اہم تربیتی موضوعات پر مشتمل ہیں: پہلا موضوع غیر ضروری اور فضول سوالات کی ممانعت ہے جن سے انسان اپنے لیے بلاوجہ سختی و پابندی کا دروازہ کھول لیتا ہے، اور دوسرا موضوع دورِ جاہلیت کی ان توہم پرستانہ رسوم کی تردید ہے جن میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام جیسے جانور بتوں اور نذروں کی نیت سے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ آیت نمبر 101 میں ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! ایسی چیزیں نہ پوچھو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں، اور اگر تم انہیں اس وقت پوچھو جب قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی؛ اللہ نے ان سے درگزر فرمایا ہے اور اللہ بخشنے والا، بردبار ہے۔ آیت نمبر 102 میں بتایا گیا کہ تم سے پہلے ایک قوم نے یہی سوالات کیے تھے پھر وہ ان کی وجہ سے کفر میں پڑ گئی۔ آیت نمبر 103 میں جاہلی نذروں کی تردید ہے کہ اللہ نے نہ بحیرہ بنایا نہ سائبہ، نہ وصیلہ نہ حام، لیکن کافر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔ زیرِ نظر نوٹ میں دونوں موضوعات کی تفصیل، ان کے اسباب اور ان سے حاصل ہونے والے اسباق بیان کیے جائیں گے۔

فضول سوالات کی ممانعت: مفہوم اور اقسام

فضول سوال سے مراد وہ سوال ہے جس کا نہ دینی فائدہ ہو نہ دنیاوی ضرورت، یا جس کے جواب سے انسان پر ایسی پابندی عائد ہو جائے جو پہلے نہیں تھی، یا جس کا تعلق ان غیبی و خفیہ امور سے ہو جن کا جاننا انسان کے لیے ضروری ہی نہیں۔ نزولِ وحی کے دور میں ایسے سوالات کی خطرناکی دوگنی تھی، کیونکہ جب کسی چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا اور اس پر وحی نازل ہو جاتی تو وہی حکم پوری امت کے لیے واجب ہو جاتا؛ اسی بنا پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں جب تک چھوڑ رکھوں تم بھی مجھے چھوڑ رکھو، تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء سے کثرتِ سوال اور ان کی مخالفت کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ ایک صحابی کے اس سوال پر کہ کیا حج ہر سال فرض ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال فرض ہو جاتا اور تم اس کی طاقت نہ رکھتے۔ اس سے ممانعت کا دائرہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ممانعت ان سوالات کی ہے جو محض تجسس، لاابالی پن یا احکام میں بلاوجہ سختی پیدا کرنے کا سبب بنیں؛ البتہ علم حاصل کرنے، مسئلہ سمجھنے اور عمل کی غرض

سے سوال کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب ہے، کیونکہ خود قرآن نے حکم دیا ہے کہ اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھو۔ چنانچہ فقہاء نے سوال کی تین قسمیں بیان کی ہیں: واجب سوال جو فرض کی ادائیگی کے لیے ضروری ہو، مستحب سوال جو علم و فہم بڑھائے، اور ممنوع و مکروہ سوال جو فضول تجسس یا سختی پیدا کرنے والا ہو۔

فضول سوالات کے نقصانات اور سابقہ قوم کی مثال

آیت نمبر 102 نے اس ممانعت کی تاریخی دلیل یہ دی ہے کہ تم سے پہلی قوم نے اسی طرح کے سوالات کیے تھے، پھر وہ ان کے کفر کا سبب بن گئے۔ اس سے بنی اسرائیل کے واقعات کی طرف اشارہ ہے: گائے ذبح کرنے کے واقعے میں انہوں نے بار بار غیر ضروری سوالات کر کے اپنے لیے سختی پیدا کر لی حتیٰ کہ گائے کی تلاش تقریباً ناممکن ہو گئی، اسی لیے کہا گیا کہ انہوں نے ذبح تو کیا مگر لگتا نہ تھا کہ کریں گے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے دسترخوان مانگے اور بعض اقوام کے آیات کا مطالبہ کرنے کے واقعات بھی اسی قبیل سے ہیں کہ مطالبہ پورا ہونے کے بعد انکار کا عذر ختم ہو جاتا ہے اور پھر نافرمانی سیدھا کفر و عذاب تک لے جاتی ہے۔ فضول سوالات کے دینی نقصانات میں احکام کی سختی، عمل کی مشقت اور نبی کی ناراضی شامل ہیں، جبکہ نفسیاتی نقصان یہ ہے کہ انسان اصل واجبات و فرائض سے غافل ہو کر جزئیات و فضولیات میں الجھ جاتا ہے اور دین اس کے لیے آسانی کے بجائے بوجھ بن جاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دین میں آسانی رکھی ہے اور وہ امت کے لیے تنگی نہیں چاہتا۔ آیت کے آخر میں اللہ کو غفور و حلیم قرار دے کر دروازہ توبہ و اصلاح کی طرف بھی رکھا گیا ہے کہ جن سے ایسے سوالات سرزد ہو چکے ہوں وہ باز آ جائیں تو اللہ ماضی سے درگزر فرمانے والا ہے۔

دورِ جاہلیت کی نذر و منت: بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام

آیت نمبر 103 میں جن چار چیزوں کی تردید کی گئی ہے وہ عربِ جاہلیت کی توہم پرستانہ نذر و منت کی صورتیں تھیں۔ بحیرہ اس اونٹنی کو کہا جاتا تھا جس کے کان چیر دیے جاتے تھے اور اسے بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا، پھر نہ اسے سواری کے لیے استعمال کیا جاتا، نہ اس کا دودھ عام لوگوں کے لیے جائز سمجھا جاتا۔ سائبہ اس جانور کو کہا جاتا تھا جسے کسی منت یا بیماری سے شفایابی پر بتوں کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا، پھر اس پر نہ بوجھ لادا جاتا نہ اسے روکا جاتا۔ وصیلہ اس بکری یا اونٹنی کو کہا جاتا تھا جو مسلسل مادہ بچے جنتی اور اسے بھی اس اعزاز میں چھوڑ دیا جاتا۔ حام اس نر اونٹ کو کہا جاتا تھا جس سے نسل کشی کی ایک مقررہ مدت پوری ہو جاتی تو اس کی پشت کو سواری و بوجھ سے "محفوظ" کر کے آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ ان رسوم کی بنیاد نہ وحی تھی نہ عقل، بلکہ محض آباء کی تقلید اور

بتوں سے منسوب خوف وامید تھی؛ مالک اپنی ملکیت کو بے مصرف کر کے دوسروں کی چراگاہوں اور وسائل پر بوجھ ڈالتا اور اسے دین سمجھتا۔ ان رسموں کی ایک خرابی یہ بھی تھی کہ معاشرے کا ایک قابلِ ذکر سرمایہ ضائع ہوتا اور امرا و سردار اس توہم پرستی سے اپنا اثر و رسوخ قائم رکھتے تھے۔

جدول: دورِ جاہلیت کی نذر و منت کی صورتیں

رسم	صورت	حیثیت
بحیرہ	کان چیری ہوئی اونٹنی بتوں کے نام پر چھوڑ دی جاتی	اللہ نے اسے مشروع قرار نہیں دیا
سائبہ	منت یا شفا پر جانور آزاد چھوڑ دیا جاتا، اس سے کوئی کام نہ لیا جاتا	توہم پرستانہ رسم؛ شریعت سے اس کا کوئی ثبوت نہیں
وصیلہ	مسلسل مادہ بچے دینے والی بکری یا اونٹنی کا اعزازاً چھوڑ دیا جانا	باطل رسموں کی قرآن نے تردید کی
حام	نسل کشی کی مدت پوری کرنے والے نر اونٹ کی پشت کا محفوظ کر کے آزاد چھوڑ دیا جانا	اللہ پر افترا قرار دیا گیا

ان رسوم کی تردید کی حکمتیں

قرآن نے ان رسوم کی تردید تین بنیادی اسباب کی بنا پر کی ہے۔ پہلا سبب یہ ہے کہ یہ دین کے نام پر اللہ پر جھوٹ باندھنا تھا، کیونکہ کوئی بھی حلت و حرمت اور نذر و عبادت شارع کے حکم کے بغیر مشروع نہیں ہو سکتی؛ جس نے اپنی طرف سے کوئی دینی رسم گھڑی اس نے گویا اللہ پر بہتان باندھا۔ دوسرا سبب عقل کی رہنمائی ہے؛ آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے، یعنی عقل بھی ان رسوم کی تائید نہیں کرتی کہ قیمتی وسائل کو بے مقصد ضائع کیا جائے اور مخلوق کو ایسا تقدس دیا جائے جس کا وہ اہل ہی نہیں۔ تیسرا سبب مال و معیشت کی حفاظت ہے کہ نذر و منت کی صحیح صورت صرف وہ ہے جو اللہ کے لیے ہو اور جس سے عبادت یا خلق کی خدمت کا مقصد حاصل ہو؛ اسلامی نذر کا اصول یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کے کام کی نذر مانی

جائے تو اسے پورا کرنا واجب ہے، معصیت کی نذر کا پورا کرنا جائز نہیں، اور جاہلی انداز میں جانور ضائع کرنے یا بتوں سے منسوب کرنے کی نذر سرے سے مشروع ہی نہیں۔ اس تردید نے دین کو انسانی ساختہ رسوم سے پاک کر کے اس کی اصل بنیاد یعنی وحی پر قائم کر دیا اور یہ اصول ہمیشہ کے لیے دے دیا کہ دین وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے بتایا، نہ وہ جو رسم و رواج نے گھڑ لیا۔

ان آیات سے حاصل ہونے والے اسباق

ان تین آیات سے کئی ابدی اسباق حاصل ہوتے ہیں۔ پہلا سبق یہ ہے کہ دینی معاملات میں سوال کا مقصد عمل و ہدایت ہونا چاہیے، محض بحث و تجسس نہیں؛ طالب علم کو وہی سوالات کرنے چاہئیں جو اس کے علم و عمل میں اضافہ کریں۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ دین میں اپنے اوپر خود سختی پیدا کرنا ناپسندیدہ ہے؛ شریعت آسانی چاہتی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ آسان پہلو اختیار فرمایا جب تک وہ گناہ نہ ہو۔ تیسرا سبق یہ ہے کہ نذر، منت اور ہر دینی عمل کے لیے کتاب و سنت کی دلیل ضروری ہے، آباء کی تقلید دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ جاہلیت کی رسوم بھی یہی کہہ کر جاری رکھی جاتی تھیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی پر پایا۔ چوتھا سبق یہ ہے کہ اللہ پر افترا سب سے بڑا جرم ہے، خواہ وہ عقیدے کی صورت میں ہو یا رسم کی صورت میں، اور پانچواں سبق یہ ہے کہ عقل کا درست استعمال دین کا دشمن نہیں بلکہ اس کا معاون ہے؛ قرآن بار بار عقل سے کام لینے کی دعوت دیتا ہے اور اسی عقل سے انسان جاہلی توہمات کی بیہودگی کو پہچان سکتا ہے۔ آج کے دور میں بھی بے شمار رسمیں، بے دلیل نذریں اور غیر ضروری بحثیں انہی دو خرابیوں کی جدید صورتیں ہیں جن کی اصلاح کے لیے یہ آیات آج بھی اسی طرح رہنما ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ آیات 101 تا 103 میں فضول سوالات کی ممانعت اس حکمت کے تحت کی گئی ہے کہ یہ سوالات احکام میں بلاوجہ سختی، عمل میں مشقت اور بالآخر انکار و کفر تک لے جا سکتے ہیں، جبکہ دورِ جاہلیت کی نذر و منت یعنی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کی تردید اس لیے کی گئی ہے کہ یہ وحی کی دلیل کے بغیر اللہ پر افترا اور عقل و مال دونوں کی تباہی تھی۔ ان آیات نے دین کو وحی کی بنیاد پر قائم رکھنے، سوال کو علم و عمل کے مقصد سے جوڑنے اور ہر رسم کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھنے کا وہ سنہرا اصول دیا ہے جو ہر دور کے مسلمان کی فکری حفاظت کی ضمانت ہے۔